ڈاکٹر ناصر رانا
اُستاد و پرنسپل، گورنمنٹ ڈگری کالج
شرق پور شریف، پنجاب

پنجابی اور سندھی صوفی شاعری میں امن و محبّت کا اظہار

ABSTRACT

Expression of love and peace in Sufi Poetry of Punjabi and Sindhi.
By Dr. Nasir Rana, Principal, Govt. Degree College, Sharakpur Sharif, Punjab.

The tradition of Sufism and mystic poetry has a long history in Sindhi and Punjabi literatures. Aside from some well known Sufis, some of the prominent poets of Punjabi and Sindhi have elaborated upon the idea of love and peace in their poetry. Shah Hussain, a poet of Punjabi and Shah Abdul Latif, a poet of Sindhi, as well as some other poets of these languages have also presented the idea of love and peace through their poetry. This article cites examples of such verses that have composed upon the idea of peace and love.

تصوف ایک تہذیبی رویہ اور روح کی پاکیزگی کا عمل ہے جو دُنیا کے سبھی بڑے مذاہب میں موجود ہے۔ اس کی خاصیت ہے کہ اس کے پیروکار اپنے اپنے مذہب میں رہتے ہوئے بھی دُوسرے مذاہب کے ساتھ قابل ذکر اشتراکات و مترادفات رکھتے اور باہم مترتب دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے متصوف پیدا ہوئے ہیں۔ عیسائیت میں سینٹ جوزف (St Joseph) (ق م ۱۸۳۰ء)، تھامس بیکٹ (Thomas Backett) (۱۱۷۰ء۔۱۱۱۸ء) اور ڈیٹرچ بونوفر (Dietrich Bonhoeffer) (۱۹۰۶ء۔۱۹۴۵ء)، ہندومت میں میرابائی (Mirabai) (۱۴۹۸ء۔۱۵۵۷ء)، سوامی ویویک نندا (Swami Vivekananda) (۱۸۶۳ء۔۱۹۰۲ء)، سائیں بابا (Sai Baba of Shirdi) (۱۸۶۰ء۔۱۹۱۸ء)، بدھ مت میں میلا رِپا (Milarepa) (۱۰۵۲ء۔۱۱۳۳ء) اور دلائی لاما سکول بالخصوص لہا موتھا ندرب (Lhamo Dondrub)، دلائی لاما ۱۴ (پ ۱۹۳۵ء)، اسلام میں رابعہ بصری (Rabia Basri) (۷۱۷ء۔۸۰۱ء)، بایزید بسطامی (Bayazeed Bistami) (۸۰۴ء۔۸۷۴ء)، منصور حلاج (Mansoor Al-Hallaj) (۸۵۸ء۔۹۲۲ء)، علی بن عثمان ہجویری (Ali bin Usman Hajvaeri) (۹۸۶ء۔۱۰۷۲ء)، معین الدین چشتی (Moeen ud Din Chisthi) (۱۱۴۱ء۔۱۲۳۰ء) اور جین مت میں مہاویرا (Mahavira) (۴۶۸ ق م۔۵۴۰ ق م) اور ترتھانکرا (Trthankara) سکول کو تصوف میں بڑا مقام حاصل ہے اور یہ لوگ بہت سے دیگر نام ور اہل تصوف کے ساتھ اپنے اپنے مذاہب میں نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ سبھی بڑے فلاسفہ اور اکثر شعراء ہیں۔ ان کی تعلیمات عام طور پر ان کے کلام ہی کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچیں اور وہ کلام اتنا مؤثر رہا کہ صدیوں تک اس کے اثرات عام آدمی کی زندگی پر مرتب ہوتے رہے۔ ان صاحبانِ معرفت نے اپنے نظریات کے اظہار اور تبلیغ کے لیے وعظ، نصیحت اور تصانیف کو ذریعہ بنایا۔ ان کا شمار اپنے اپنے حلقے کے دانش وروں اور رُجحان ساز اکابر میں ہوتا ہے جنھوں نے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی راہ نمائی کی اور یہ راہ نمائی سینکڑوں ہزاروں برسوں سے ہدایت کی زنجیری کڑیوں کی طرح مسلسل ہے۔

قرآن مجید بلاشبہ یقین کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کی دعوت توحید، رسالت اور آخرت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی رویے اپنانے کی دعوت ہے۔ قرآن واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اصل اہمیت آخرت کی ہے اور وہاں کام یابی اُن لوگوں کو ملے گی جو اعلیٰ اخلاقی رویوں پر قائم ہوں گے؛ اور یہی اعلیٰ رویے تصوف کا مقصود بھی ہیں۔ لیکن عوام کو سمجھانے کے لیے کڑی جدوجہد کی ضرورت ہے کہ انسان کے بچے کو پڑھانا، سمجھانا دُنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ایسی جدوجہد کرنے والوں کو کلامِ رب العلیٰ میں ''متقی'' کہا گیا ہے۔ قرآن کا آغاز ہی سورۂ فاتحہ کے بعد سورۃ بقرہ کے الفاظ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ سے ہوتا ہے۔ سورۃ عنکبوت کے مطابق ہدایت کی ذمہ داری اُن لوگوں کی ہے جو جدوجہد کے لیے تیار ہوتے ہیں (۱)۔ قرآن اور دین کا عملی ڈھانچہ سنت ہے جس میں تکبر، حسد، تعصب اور بددیانتی سے احتراز اور اغماض کی تلقین ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اخلاص، صبر، شکر، عجز اور انکساری بڑی نیکیاں ہیں اور نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، معیشت، سیاست اور معاشرت انسانی معاشرے کی مثبت ضرورتیں ہیں۔ تصوف انھی کو معاشرے میں رائج اور زندہ رکھنے کی عملی جدوجہد کرتا ہے۔

تصوف کو قرآنی اصطلاح میں تزکیہ نفس قرار دیا گیا ہے اور اس کی سند قرآن مجید کی آیت: هُوَ الَّذِی بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوا عَلَیهِم اٰیاتِهٖ وَیُزَکِّیهِم وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَاِن کَانُوْ مِن قَبْلُ لَفِی ضَلَالٍ مُّبِین (وہی ہے جس نے اُمّیوں میں ایک رسول انھیں میں سے مبعوث فرمایا جو ان پر اُس کی آیتیں پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے؛ اور بے شک وہ اس سے پہلے صریح گمرہی میں تھے)، سے لی گئی ہے (۲)۔ جب کہ حدیث میں سے اس کا تعلق صحیح بخاری کی اس روایت سے ہے جس میں کہا گیا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے جیسے تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہ دیکھ سکے تو یقیناً وہ تمھیں دیکھ رہا ہے (۳)۔

سید علی بن عثمان ہجویری تصوف کی شناخت قائم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تَصَوّف حِکَایَة لِلصّفا بِلا شِکایَه ہے۔ یعنی تصوف صفا کی ایسی حکایت وتعبیر ہے جس میں شکوہ شکایت نہ ہو۔ وہ تصوف میں تین طرح کے لوگوں کی نشان دہی کرتے ہیں: ''صوفی صاحب وصول ہے، متصوف صاحبِ اصول اور مستصوف صاحب نقول وفضول (۴)۔''

یوں اہل تصوف صاحبانِ علم ہونے کے ساتھ ساتھ تعلق باللہ کے قائل ہیں۔ یہ وہ باصفا لوگ ہیں جو خالق و مالک سے محبت اور ربط میں کامل اور متوکل ہوتے ہیں۔ وہ نفسانی رُجحانات وخواہشات سے احتراز رکھتے ہیں اور خوشنودیٔ حق تعالیٰ ان کا مقصدِ حیات ہے۔ تصوف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بدولت خدا انسان کا محبوب بن جاتا ہے۔ یوں تصوف مذہب کی روح ہے۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ دُنیا میں جتنے بھی عظیم فلسفی گزرے ہیں، سب نے فلسفے کے ساتھ ساتھ تصوف کی ضرورت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ دُنیائے افکار میں انتہائی بلند مقام صرف سائنس اور تصوف کے اتحاد سے حاصل ہوسکتا ہے اور بہترین انسانی خوبیوں کا اظہار تصوف ہی کے ذریعے ممکن ہے(۵)۔ اس کا مطلب ہوا کہ زندگی کو سمجھنے کے لیے تصوف ایک اہم ضرورت ہے۔ اس معاملے کی تفہیم شیخ عطار کے کلام میں یوں ملتی ہے:

چشم بکشا کہ جلوۂ دِلدار
متجلّی است از در و دیوار

اور اقبال صوفی کو عشق کا بندہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

اسلام سے قبل عیسائی طریقت میں رہبانیت یا ترکِ دنیا مذہب کا حصہ بن چکا تھا اور اسے یونانی نظریات نے اور بھی جلا دی۔ اسلام نے ترکِ دُنیا کو ناپسند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اُن لوگوں نے رہبانیت خود ایجاد کی تھی، ہم نے اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ انھوں نے یہ طریقہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا مگر اسے صحیح طور پر نبھا نہ سکے(۶)۔'' اسلامی تصوف کا راستہ تجرد اور بن باس سے نہیں گزرتا بل کہ یہاں ''لا رہبانیت'' کی شرط اور کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور ہنکار سے بچنا بڑائی اور اعلیٰ انسانی شناخت ہے۔ اس کی جڑیں اُپنشد میں بھی ملتی ہیں۔ منڈک اُپنشد میں سوال ہے: ''وہ شے کیا ہے جس کا عرفان ہوجانے سے سارے جگت کا عرفان ہوسکتا ہے؟'' اور پھر اس کا جواب ہے: ''وہ شے خدا ہے؛ اگر انسان کو اس کا عرفان حاصل ہوجائے تو ساری کائنات کا عرفان حاصل ہوجائے گا(۷)۔'' بہرحال اُپنشد ہوں یا اسلام کے افکار، سبھی کا مقصد مقصود بالذات سے محبت ہے اور مقصود بالذات سے محبت کا مطلب اُس کے احکام کی پیروی ہے اور اس کے احکام کی روح اُس کی مخلوق سے محبت میں پنہاں ہے۔ مقصود بالذات کے احکام کی رُوح یعنی خدا کے بندوں سے محبت اور عظیم بھائی چارے کی بنیاد مواخات کے نام سے پہلے مکے میں سولہ مرد مسلمانوں کو دو دو کے گروپوں میں باہم بھائی بنا کر رکھی گئی۔ یاد کیجیے یہی وہ موقعہ ہے جب جنابِ علیؓ نے پوچھا تھا: ''میرا بھائی کون ہے؟'' تو رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''مَیں تمھارا بھائی ہوں (۸)۔'' جب کہ دوسری مواخات ہجرت کے پانچ ماہ بعد مدینے میں مہاجروں اور مقامیوں کے درمیان قائم ہوئی جس کا آغاز انس بن مالکؓ کے گھر سے ہوا اور کچھ ہی دنوں میں سارے مہاجر کسی نہ کسی انصاری کے بھائی بن گئے (۹)۔ نبی ﷺ کے میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کو صلحِ کل کی آفاقی مثالوں کی حیثیت حاصل ہے۔ خاص طور پر معاہدہ حدیبیہ کے موقعے پر سہیل بن عمرو کے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' اور ''محمد رسول اللہ'' کے اندراج پر ''باسمک اللھم'' اور ''محمد ابن عبداللہ'' کی تبدیلیاں تاریخ عالم میں امن وسلامتی کی راہ ہم وار کرنے کی بہت بڑی مثالیں ہیں (۱۰)۔ حلف الفضول اگرچہ اعلان نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن اعلان رسالت کے بعد نبی محترم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''مَیں عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک ایسے معاہدے میں شریک تھا کہ مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی پسند نہیں اور اگر دَورِ اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جاتا تو مَیں لبیک کہتا (۱۱)۔'' اس سلسلے میں ہجرت سے پہلے مکّے میں رسولِ خدا ﷺ کے گھر کا گھیراؤ، ہجرت اور مغازی؛ ہر موقعے پر اللہ کے رسول ﷺ کا درگزر اور صلہ رحمی بعد میں وجود میں آنے والے فلسفہ تصوف کے لیے زادِراہ بنے ہیں اور صوفیوں نے شریعت کو اسلام کا ظاہر اور طریقت کو اس کا باطن قرار دیا۔ مکہ کی فتح اُس وقت کے capital کی فتح تھی جس موقعے پر انسانِ اعظم ﷺ اور اُن کے پیروکاروں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینے کی بجائے لاتثریب علیکم الیوم کی مثال تاریخ تو تاریخ، آج کی مہذب دُنیا میں بھی موجود نہیں۔ کون ہے جو امن کا اتنا پرچارک ہے؟

یہ ڈیرہ داریاں، لنگر، صدقہ وخیرات اور دِلداریاں اسی فلسفے کے باعث ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا سبق اور جدید زمانے کی مواخات، اسی فلسفے کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے اور استاد بھائی، پیر بھائی یوں ہی بنتے ہیں۔ خانقاہوں میں علم وادب پنپتا ہے اور ایمان ومعرفت کے راستے بھی یہیں سے نکلتے ہیں۔ اسلام میں تصوف کے آغاز کے بارے میں جولین بالڈیک (Julian Baldick) لکھتے ہیں کہ اس سلسلے کا آغاز ان حالات میں ہوا کہ حارث محاسبی (م ۸۵۷ء) مراقبہ اور نفس کے محاسبے کے قائل تھے اور سماع، شاعری اور موسیقی کو خدا سے لو لگانے کا ذریعہ سمجھتے تھے جب کہ ذوالنون مصری (م ۸۶۱ء) نے سیر وسلوک کا راستہ اختیار کیا۔ بایزید بسطامی (م ۸۷۵ء) نے طریقت میں ''شاتھ'' کے نام سے مخصوص اوراد ووظائف رائج کیے اور ''فنافی اللہ'' کا نظریہ پیش کیا جب کہ سہل بن عبداللہ تستری (م ۸۸۶ء) کی تعلیمات کا دارومدار ''یقین'' پر ہے۔ یہی وہ صوفی ہیں جنھوں نے پہلی بار طریقت میں ''بقا باللہ'' کا خیال بھی پیش کیا۔ انھی کے ایک ہم عصر خاراز (م ۸۹۹ء) نے بغداد میں ''فنا'' اور ''بقا'' کی تفہیم پیش کی۔ دسویں صدی عیسوی میں خازارانی (م ۱۰۳۵ء) نے ''دیار'' کی روایت شروع کی جس کے تحت خانقاہ کے ساتھ مسجد کی تعمیر اور مسافروں کے لیے رہائش اور خوراک کا بندوبست ہونے لگا جو آج تک جاری ہے (۱۲)۔ یوں اسلام میں تصوف یقین، خداخوفی، صلہ رحمی، امن، محبت،

درگزر اور خدمت خلق کی خصوصیات لے کر آگے بڑھا۔

مسلمانوں کے علاوہ عیسائی، بدھ، ہندو اور یہودی تصوف میں بھی برداشت، درگزر، محبت اور امن بنیادی جزو ہیں۔ شنکر اچاریہ Adi Shankara (۷۸۸ء۔۸۲۰ء) کی عرفان ذات کے موضوع پر کتاب ''آتم بودھ'' اُن کے نظریہ ادویت اور وحدانیت کی تفہیم ہے۔ وہ جہالت کے ازالے کی دو شرائط: (۱) ویراگ یعنی ترک اور (۲) آتم شدھی یعنی تزکیہ نفس قرار دیتے ہیں۔ یہ تزکیہ نفس کم وبیش وہی تزکیہ ہے جو مسلمان صوفیہ نے اختیار کیا۔ ایک اور جگہ وہ عرفان ذات یامَنْ عَرَفَ نَفْسَه' فَقَدْ عَرَفَ رَبَّه (جس نے خود کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا) کی وضاحت یوں کرتے ہیں: ''مطالعہ، دھیان اور مراقبے کے ذریعے انسان اپنی نفسانی خواہشات سے آزادی پا کر اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے۔ اپنے عرفان کے لیے اپنے آپ ہی کو لگانا پڑتا ہے اور اپنے آپ کی دریافت کے بعد ہی اپنی لامحدودیت کا پتا چلتا ہے(۱۳)۔'' قرآن ان تعلیمات سے بھرا پڑا ہے۔ سورۃ الحجرات کے مضامین اور صحیح بخاری کی حدیث: المسلم من سلم المسلمون من اِلّسانه ویده (مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں) کے مضامین بھگوت گیتا میں بھی اس طرح بیان ہوئے ہیں: ''لوگوں کو اپنی زبان، سوچ اور عمل سے تکلیف نہ پہنچاؤ، انصاف کا دامن پکڑ لو، غرور نہ کرو، دل کو قابو میں رکھو، کسی کی چغلی نہ کرو، دان کرو، لالچ نہ کرو، نرمی اختیار کرو، آنکھ، زبان اور کان کو قابو میں رکھو، ہر طرح کی برائی سے دُور رہو، معاف کرو، صبر کرو، اندر اور باہر کو صاف رکھو اور کسی کو اپنا دشمن نہ سمجھو(۱۴)۔''

کارل ڈبلیو ارنسٹ کے مطابق مسلمانوں میں ابو ہاشم (وفات ۷۳۶ء) وہ پہلے صاحب حال ہیں جن کو ان کے بعد والوں نے صوفی گردانا(۱۵)۔ جب کہ اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ حسن بصری (۶۴۲ء۔۷۲۸ء) وہ عالم ہیں جنھوں نے دنیاداری سے دُور رہتے ہوئے زاہدانہ زندگی اپنائی اور ابتدائی اسلام کی سادہ گزر بسر اختیار کی۔ وہ جلیل القدر تابعی، مفسر اور محدث تھے۔ انھوں نے ام المؤمنین ام سلمہؓ کی ایک لونڈی کے ہاں جنم لیا اور اُم المؤمنینؓ ہی کے گھر پرورش پائی۔ انھوں نے صحابہ کرام کے عمل کو آنکھوں سے دیکھا۔ انھیں کے سامنے اسلامی سلطنت کی سرحدیں پھیلیں تو اخلاقی انحطاط وانتشار کی کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ اسی صورت حال میں اصلاح کی ضرورت پیدا ہوئی اور تعلق باللہ کے لیے دعوت کی ابتدا بھی ہوئی۔ دراصل یہیں سے اسلام میں فلسفے کا دَور شروع ہوا جو ابتدائی بے لاگ تقلیدی دَور کے بعد ہر قوم کا مقدر ہے۔

اسلام کے پُرامن، محبت کے پرچارک اور صلح کل ہونے ہی کی وجہ سے یہ اس وقت مشرق بعید سے مغرب بعید تک کرۂ ارض پر کم وبیش ڈیڑھ ارب انسانوں کا دین ہے اور اس کو اتنے بڑے علاقے اور اتنی بڑی آبادی کا دین بنانے میں بڑا حصہ سلسلہ قادریہ، نقش بندیہ، سہروردیہ، چشتیہ وغیرہ اور ان کی شاخوں سے متعلق صوفیہ کا ہے۔ آج بھی یورپ، امریکا

اور مشرق بعید میں تمام تر نئی روشنی کے باوجود اسلام پھیل رہا ہے۔ بھارت میں ہندو مسلم ایکتا منچ لکھنؤ کے بانی سوامی لکشمی شنکر اچاریہ بھی تفصیلی مطالعات کے بعد اسلام کو امن کا دین قرار دے رہے ہیں (۱۶)۔ان علاقوں میں اسلام کے قبول عام میں موسیقی اور سماع کو بھی دخل حاصل ہے۔

ہمارے شاعروں اور فلسفیوں کے مطابق صوفی خود کے لیے مُردہ اور خدا کے لیے زندہ ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں خود کو اللہ کی مکمل سپردگی میں دینا تصوف ہے۔سالک جانتا ہے کہ جو شخص تحقیق اور توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں کچھ نصیب نہیں ہوتا۔تصوف شریعت سے الگ نہیں بل کہ شریعت سے الگ تصوف کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان صوفیہ میں با یزید بسطامی (۸۰۴ء ۔ ۸۷۴ء)، جنید بغدادی (۸۳۰ء ۔ ۹۱۰ء)، عبدالقادر جیلانی (۱۰۷۷ء۔۱۱۶۶ء) اور ابن العربی (۱۱۶۵ء۔۱۲۴۰ء) وغیرہم، امن ومحبت کے نمائندہ ہیں۔ابوالقاسم قشیری کا ''رسالہ قشیریہ''، شیخ عبدالقادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین''، ''فتوح الغیب'' اور ''فتح الربانی''، سید علی بن عثمان ہجویری کی ''کشف المحجوب''، شیخ شہاب الدین سہروردی کی ''عوارف المعارف'' اور ابن العربی کی ''فتوحات مکیہ'' اور ''فصوص الحکم'' علم و معرفت کے اسی فلسفے کی شہرہ آفاق تصانیف ہیں۔آج کے غیر مسلم متصوف بزرگوں میں مہر بابا (۱۸۹۴ء۔۱۹۶۹ء)، مرشد سیموئل لوئیس (۱۸۹۶ء۔۱۹۷۱ء)، منوہر لال کان پوری (۱۸۹۸ء۔۱۹۵۵ء) اور ارپنا ٹویڈی (۱۹۰۷ء۔۱۹۹۹ء) بھی آفاقی امن اور محبت کا درس دیتے ہیں۔

اسلام میں اوپر مندرج معروف صوفیوں اور انھی جیسے سینکڑوں صوفی راہ نماؤں کے علاوہ سنائی، سعدی، جامی، رُومی، خسرو، شہباز قلندر، شاہ حسین، سلطان باہو، رحمن بابا، شاہ لطیف، سچل سرمست، بلھے شاہ اور خواجہ فرید نے صوفی شعراء کا درجہ پایا اور ایک جہان کو اپنے خیالات ونظریات سے متاثر کیا۔ان شعراء کے کلام میں بیک وقت شریعت اور طریقت کا درس شامل ہے۔خالق ومخلوق کے درمیانی فاصلے مٹانے کے لیے انھوں نے عشق ومحبت کا درس دیا۔ان کے ہاں عزم وہمت، جہدِ مسلسل اور معاشرتی ظلم وناانصافی کے خلاف علم جہاد بلند کیا گیا ہے۔صوفیوں اور فقیروں کی خانقاہوں کے دروازے خاص وعام کے لیے دن رات کھلے رہتے ہیں اور یہ عوام الناس کے درد کے درماں کا مقام ہیں۔یہاں محبتوں، قربتوں اور وسعتوں کے جام لنڈھائے جاتے ہیں۔یہ کس کو معلوم نہیں کہ سچا مذہب سب سے محبت کرنا ہے اور یہ صوفیوں کی تہذیب ہے۔سب عبادتوں، پوجا اور دھرم استھانوں کی غرض صرف مالک کی یاد ہے اور مالک کی محبت اس کی مخلوق کی محبت میں پنہاں ہے۔نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے ''خیر الناس من ینفع الناس'' یعنی انسانوں میں اچھا وہ ہے جو دوسروں کے لیے مفید ہو۔برصغیر کے عظیم صوفی نوشہ گنج بخش کی اپنے پیروکاروں کے لیے وصیّت ہے: ''ہر کسی سے الفت اور محبت کی جائے۔جہاں تک ہو سکے دوسروں کے مفاد کو اپنے فائدے سے برتر رکھا جائے اور لوگوں کی طرف سے

تکالیف اور جفا پر صبر کر کے اللہ سے مدد مانگی جائے۔'' (۱۷) پنجابی صوفی شعراء اسی راستے کے مسافر ہیں۔

پاکپتن کے بابا فرید (۱۱۷۳ء۔۱۲۶۵ء) کو بیک وقت اُردو اور پنجابی کا شاعر مانا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں قاری اور سامع کی تسکین وراہ نمائی کا بہترین سامان موجود ہے۔ وہ موہ، محبت کے پرچارک اور مالک ورازق کے در پر خود جھکنے اور دوسروں کو جھکانے والے ہیں۔ ایک بار انھیں کسی لوہار عقیدت مند نے تحفے کے طور پر چھری پیش کی تو انھوں نے فرمایا: 'میرے پاس چھری نہ لاؤ، سوئی لاؤ۔ ہمارا کام کاٹنا پیٹنا نہیں، جوڑنا اور سینا ہے (۱۸)۔

وہ اپنے ایک اشلوک میں کہتے ہیں:

کاگا سب تن کھائیو ، چن چن کھائیو ماس
دو نیناں مت کھائیو ، پیا ملن کی آس (۱۹)

یعنی کوے! میرا سارا جسم کھالینا، چن چن کر گوشت نوچ لینا لیکن یہ دو آنکھیں نہ کھانا کہ انھیں اپنے دوست اور پریتم سے ملنے کی امید ہے۔ اُن کی تعلیمات میں ہے کہ اللہ دل میں رہتا ہے۔ اس کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تو پکی کھجوروں کی طرح ہے جو خود بہ خود جھولی میں آ گرتی ہیں؛ وہ مل جائے تو ساری دُنیا اپنی ہو جاتی ہے۔ بابا فرید عمل کے ذریعے زندگی بنانے کا درس دیتے ہیں کہ بروقت کیا کام زیادہ مفید ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

جن لوئن جگ موہیا سے لوئن مَیں ڈِٹھ
کجل رِیکھ نہ سہندیاں، سے پنکھی سوئے ڈِٹھ (۲۰)

یعنی تو نے اُن آنکھوں کو دیکھا ہے؟ جو کبھی ساری دُنیا کو رِجھایا کرتی تھیں۔ یہ خوب صورت آنکھیں ایک زمانے میں کاجل بھی برداشت نہیں کرتی تھیں اور اب اُن میں چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا ہے۔ اُن کا وہ اشلوک تو زباں زدِ عام ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ خالق اور مخلوق کچھ اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ متعلق ہیں کہ ان میں سے ہر کوئی قابل عزو فخر ہے۔ شلوک ملاحظہ کیجیے۔

فریدا خالق خلق میں ، خلق وسّے رب مانہہ
منداکس نوں آکھیے جاں تِس بن کوئی نانہہ (۲۱)

لاہور کے شاہ حسین (۱۵۳۹ء۔۱۵۹۹ء) شہرہ آفاق صوفی ہیں۔ ان کا گھرانہ نومسلم تھا اور ڈُھڈی راج پوتوں نے تبدیلی مذہب کی بنا پر نوربافی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ حسین کا بچپن اسی ماحول میں گزرا۔ تبھی انھوں نے اپنی شاعری کے لیے چرخہ، تکلا، تانا، بانا اور جولاہا جیسی بامعنی تراکیب منتخب کیں۔ انھوں نے فیضی، نظیری اور عرفی کا زمانہ پایا۔ ان ہی نے سب سے پہلے پنجابی میں نسائی لہجے میں شاعری کی اور اس زبان میں یہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہیر اور رانجھا

کے کرداروں کو نقش اوّل arche type حیثیت دی۔ وہ شاعری میں ''کافی'' کی صنف کے بانی بھی ہیں جسے بعد میں اس پورے خطے میں صوفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے سب سے اہم صنف کا درجہ حاصل ہوا۔ اُن کے کلام میں فنا فی اللہ کے مقام کی بازگشت ملتی ہے۔ ایک کافی ملاحظہ کیجیے جس میں وہ انکسار اور عجز کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: اے پروردگار میرے حال سے تو واقف ہے۔ اندر تو ہے، باہر بھی تو ہے اور میرے رُوئیں رُوئیں میں تو ہے۔ تو میرے کام کی لمبائی کا دھاگا بھی ہے اور چوڑائی کی ڈوری بھی۔ حسین فقیر کہتا ہے کہ میری کوئی ہستی نہیں، صرف تیری ذات اور تو ہی تو ہے۔ کافی یوں ہے:

ربا میرے حال دا محرم توں
اندر توں ہیں، باہر توں ہیں، روم روم وچ توں
توں ہَیں تانا، توں ہَیں بانا، سب کجھ میرا توں
کہے حسین فقیر نمانا، مَیں ناہیں، سب توں! (۲۲)

شاہ حسین کا سارا کلام زندگی کے مثبت استعمال اور اس کی مشکلات کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ وہ جاننے، کرنے، سمجھنے اور کرتے رہنے کو زندگی سمجھتے ہیں اور اسی کا درس دیتے ہیں۔ اُن کی تعلیمات میں وہی کام قابل عمل ہے جس کے نتیجے میں محبوبِ حقیقی خوش ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ قدم جس سے محبوب اور آقا و مولیٰ نالاں و ناخوش ہو، اس کا کرنا وقت اور زندگی کا ضیاع ہے۔ بھلا اُس شخص کی کیا زندگی ہے جس کا محبوب اس سے راضی نہ ہو؟ شاہ حسین خالق و مالک کو راضی رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ اسی سے معاشرے میں ایکتا، ہم آہنگی، محبت، خوشی اور امن ہوسکتا ہے۔ ان کے ہاں ''دُکھ بن راج نہیں'' کا مقولہ حاصل زندگی ہے۔ ایک کافی دیکھیے جس میں وہ رمز و کنایہ سے کام لیتے ہوئے عمل کے لیے پکارتے دکھائی دیتے ہیں۔

ویلا سمرن دا نی ، اُٹھ رام دھیاء
ہتھ ملے ، مل پچھو تاسیں ، وَیسی آ وقت وِہاء
ایس تِڑے توں بھر بھر گئیاں، اپنی وار لنگھاء
اک ناں بھریا، اِک بھر گئیاں، اِک گھرے، اِک راہِ
کہے حسین فقیر سائیں دا ، آتن پھیرا پاءِ (۲۳)

یعنی اُٹھو اور خالق و مالک کو یاد کرو۔ وقت گزر گیا تو ہاتھ ملو گے اور پچھتاؤ گے۔ اس پتن (دریا کے ساحل) سے بہت سوں نے اپنے چھاگل بھرے ہیں۔ ان میں سے کوئی گھر پہنچ چکا ہے اور کوئی ابھی رستے میں ہے۔ حسین اپنے آقا کا

فقیر کہتا ہے تجھے اپنی سہیلیوں کی محفل میں آتے رہنا چاہیے۔

جس شاعر کا پورا کلام امن کا پیغام رکھتا ہو اس پر لکھنے کو الگ موضوع و مواد چاہیے۔ یہاں ان کی صرف ایک اور کافی پیش ہے جس میں وہ انسان کو اس کا آخری وقت یاد دِلا کر اُسے زمین پر اکڑنے اور غرور و تکبر سے باز رہنے اور امن و سلامتی کی فضا قائم رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ امن کے قیام کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہے جس کی یہاں مذمت کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اکڑ اکڑ کر کیا چلنا؟ کھانا پینا، اچھے لباس پہننا اور موت کے فرشتے کے لیے تن کا پالنا عقل مندی نہیں۔ تمہیں صرف قبر کی جگہ چاہیے اور وہ بھی مرنے کے بعد۔ حسین اپنے آقا کا فقیر کہتا ہے کہ انجام کار تو مٹی ہی میں ملنا ہے۔ کافی ملاحظہ فرمایئے:

وو کیہ آکڑ آکڑ چلنا
کھا خوراکاں ، پہن پوشاکاں جمدا بکرا پلنا
ساڈھے تن ہتھ مِلک تساڈا ، جوہ پرائی ملنا
کہے حسین فقیر سائیں دا، انت خاک وچ رَلنا (۲۴)

سلطان باہو ۱۶۳۲ء میں شورکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۹۲ء میں یہیں فوت ہوئے۔ ان کی پنجابی سی حرفی اُن کے فلسفے کی عکاس ہے۔ وہ انسانی عظمت اور بڑائی علم و عمل میں دیکھتے ہیں۔ وہ ''من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ'' کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

ایہہ تن رب سچے دا حجرہ ، وچ پا فقیرا جھاتی ہو
نہ کر منّت خواج خضر دی، ترے اندر آب حیاتی ہو
شوق دا دیوا بال ہنیرے ،لبھی وست کھڑاتی ہو
مرن تھیں اگ مرگئے باہو جہناں حق دی رمز پچھاتی ہو (۲۵)

وہ کہتے ہیں کہ انسانی وجود اللہ کریم کا گھر ہے، اُس حقیقتِ مطلقہ کو پانے کے لیے دروں بینی اختیار کرو۔ آبِ حیات پینا چاہتے ہو تو خواجہ خضر کی منت سماجت کرنے کی بجائے اپنے وجود کو اس مقصد کے لیے استعمال کرو۔ من کے اندھیرے میں عشق کا دیا جلالو، اسی سے تمھارا گم گشتہ مال ملے گا۔ جو حق کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ ''انا'' کو ختم کر دیا کرتے ہیں۔ یہی بات علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کی ہے: اپنے من میں ڈُوب کر پا جا سراغ زندگی!

مضافات لاہور کے بلھے شاہ (۱۶۸۰ء۔ ۱۷۵۸ء) صوفی شعراء میں اونچے مقام کے حامل ہیں۔ یہ قادری سلسلے کی شطاری شاخ سے وابستہ تھے اور اس عہد میں ہوئے ہیں جو سیاسی طور پر غیر مستحکم اور بے یقینی کا شکار رہا۔ اس

زمانے میں وہ اُمید، رواداری، برداشت اور امن کا پیغام لے کر اُبھرے۔ انھوں نے شاہ حسین والا نسوانی لہجہ جاری رکھا۔ بلھے شاہ کی شہرہ آفاق کافی ع رانجھا رانجھا کردی نی مَیں آپے رانجھا ہوئی، اُنھی کے رنگ میں ہے۔ انھوں نے کلام میں صلحِ کل، انسان دوستی، محبت اور پیار کی جوت جگائی ہے۔ اپنے عہد کے سہم کا رُخ بدلتے ہوئے اور عمل کی تاکید کرتے ہوئے انھوں نے ایک طویل کافی لکھی ہے جس کے چوبیس بند ہیں اور وہ مسلسل دلائل سے پُر ہیں۔ پہلے دو بند ہیں:

کر کتن ول دھیان کڑے
نِت متّیں دیندی ما دِھیا
کیوں پھرنی ایں ایویں آ دِھیا
نی! شرم حیا نہ گوا دِھیا
توں کدی تاں سمجھ نادان کڑے
کر کتّن ول دھیان کڑے
چرخہ مفت تیرے ہتھ آیا
پلّیوں نہیں کجھ کھول گوایا
نہیوں قدر محنت دا پایا
جد ہویا کم آسان کڑے
کر کتّن ول دھیان کڑے(۲۶)

یعنی کاتنے (عمل) کی طرف دھیان دو۔ تمھیں ماں ہمیشہ نصیحت کرتی ہے کہ فضول وقت نہ گزارو، سمجھ داری کا مظاہرہ کرو اور اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ تمھیں چرخہ (وجود) مفت میں عطا ہوا ہے لیکن تم اس کی قدر نہیں کر رہی ہو۔ کام بہت آسان ہے لیکن تمھیں پروا نہیں۔

یہی خیال ان کی معروف کافی ''کت کڑے نہ وَت کڑے'' میں بھی پیش ہوا ہے۔ ۶/ بندوں پر مشتمل اس کافی میں وہ فرماتے ہیں کہ انسان اگر زندگی میں اچھا نہیں کرے گا تو اس کا جینا بے مقصد رہے گا۔ کام یابی اس میں ہے کہ ہم کسی کے محبوب بننے کا جتن کر سکیں (۲۷)۔ اُن کی معروف کافی ''گھڑیالی دیو نکال نی'' موہ اور پیار کے اُن لمحات کو پیش کرتی ہے جو اپنے کمال اور عروج پر ہیں۔ ان اشعار کے ذریعے وہ محبت اور سلوک کا گہرا درس دے رہے ہیں۔ کافی کا ایک بند دیکھیے ؎

گھڑیالی دیوو نکال نی
اج پی گھر آیا لال نی

گھڑی گھڑی گھڑیال بجاوے
رَین وصل دی پیا گھٹاوے
میرے من دی بات نہ پاوے
ہتھوں چا سُٹے گھڑیال نی (۲۷)

یعنی میرا محبوب گھر آیا ہے، آج وقت کو روک دیجیے۔ یہ جو گھڑیالی بار بار نوبت بجا کر وقت گزرنے کا اعلان کر رہا ہے دراصل وصال کی گھڑیوں کے مختصر ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ اُسے میرے من کی بات سمجھ نہیں آ رہی۔ اُسے گھڑیال کو ہاتھ سے چھوڑ دینا چاہیے۔

انھیں کا یہ خیال بھی عام دعوت کی حیثیت رکھتا ہے جسے قبول کر کے ہر کوئی اپنی اصلاح اور امن کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس نے قلندری راستہ اختیار کر لیا وہی ''عرفان ذات'' کی منزل پا سکتا ہے۔ ایسا ہی شخص سُکھ کے مندِر میں رہ سکتا ہے جہاں عروج وزوال کا کوئی خطرہ نہیں۔ اُن کے کلام میں ایک اور جگہ قرب اور وصال کی طلب یوں پیش کی گئی ہے:

بس کر جی ہُن بس کر جی
اِک بات اَساں نال ہس کر جی
تسیں دِل میرے وچ وسدے او
اَیویں ساتھوں دُور کیوں نسدے او
نالے گھت جادُو دِل کھسدے او
ہُن کِت ول جاسو نس کر جی(۲۸)

یعنی بس کیجیے جی بس کیجیے، ہمارے ساتھ ہنس کر بولیے۔ آپ میرے دل میں بستے ہیں، ہم سے دُوری مت اختیار کیجیے۔ آپ نے تو ہم پر اپنی محبت کا جادو کر رکھا ہے، اب اِدھر اُدھر کہاں جاؤ گے؟ بس کیجیے جی بس کیجیے، ہمارے ساتھ ہنس کر بولیے۔

سندھ کے علاقے بھٹ شاہ کے شاہ عبداللطیف (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۵۲ء) نے بھی اپنے کلام کے ذریعے امن، بھائی چارے اور محبت کی شمع روشن کی۔ ان کے مجموعہ کلام ''شاہ جو رسالو'' میں جہاں انسانی زندگی کو آسان کرنے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے وہیں لوگوں کو امن اور سُکھ تک رسائی کے لیے لوبھ اور لالچ کے بغیر جینے کا پیغام بھی دیا گیا ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیانی فاصلے ختم کرنے کے لیے آپ نے بھی عشق ومحبت کا درس دیا اور معاشرے میں پائے جانے والے گمراہ

کن تصورات کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحبِ محبت یقیناً زندگی بہتر طور پر گزار سکتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

اَچِی سارَ لَھِیج ، ساجن سُورَ تُماری آؤں ماری
سُورَ تُماری جی مَران ، تان مُون ڈوہُ م ڈِیج
دَبَنِ بَری ہتھڑا ، دارُون ، دوست ! کَریج (۲۹)

یعنی سہیلیو! مَیں اپنے دوست کے فراق مَیں مُبتلا ہوں۔ اُس کے در پر میرے جیسے بہت سے عُشّاق موجود ہوں گے۔ ماہی کے در کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بنالو کیوں کہ جس کو محبوب کیا جائے اُس کے حسن کا شکار ہونا ہی اصلِ زندگی ہے۔

وہ حقیقتوں کو پہچاننے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اُن کے الفاظ میں یہ دُنیا غم، پریشانیوں اور مشکلات کی جگہ ہے۔ اُن کا سبق ہے کہ یہاں کام یاب ہونے کے لیے سچائی کے ساتھ جُڑنے کی کوشش کریں اور دُوئی سے بچ کر اپنے آپ کو ''واحد'' پر اکٹھا کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم تخلیق خداوندی میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ڈھونڈ سکو جو درجۂ کمال کو نہ چھوتی ہو۔ اپنی آنکھوں کو یکتائی کی گواہی دینے والا بنالو تا کہ تم سچے کہلا سکو۔ وہ اپنے محبوب کو سب سے معتبر اور اہم گردانتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

چودھِین ئَ چَند ! توں اُپرین ، سہسین کرئین سینگارَ
پَلَک پِریان جی نہ پڑین ، جی حِیلَن کرئین ہزَارَ
جھڑو توں سبھَ جَمارَ ، تھڑو دَمُ دوست جو (۳۰)

یوں شاہ عبداللطیف بھٹائی انسان کو انتشار سے بچنے اور اپنی توجہ حقیقتوں پر مرکوز رکھنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ بلاشبہ انسان کی کامیابی معاملہ فہمی اور توجہ کے انتشار کی بجائے ارتکاز ہی میں ہے۔ اُن کی ایک کافی (وائی) میں کہا گیا ہے کہ ہُوت (محبوب) جس کا حامی ہوجائے، اُس کو قیامت کی کالی رات بھی آسان ہوجاتی ہے۔ مَیں لوگوں کے ساتھ اُس وقت تک نبھاؤں گا جب تک میرے دم میں دم ہے (۳۱)۔

سندھ کے سچل سرمست، اصلی نام عبدالوہاب (۱۷۳۹ء ۔ ۱۸۲۷ء) درازا نزد رانی پور سے متعلق ہیں۔ وہ سچائیوں کے امین ہیں اور معاشرتی اصلاح اور اخلاقی راہ نمائی کے علم بردار ہیں۔ انھوں نے ایک مذہبی اور روحانی خانوادے میں آنکھ کھولی اور دنیاداری سے لگاؤ نہ رکھا۔ سچل نے سماج میں محبت، امن اور بھلائی کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ وہ اپنا تعارف کرواتے اور اس زاویے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

مَیں طالب زُہد نہ تقوٰی دا ، ہک منگاں محبت مستی
ڈِتی ہن استاد ازل دے ، ہتھ طلب دی تختی (۳۲)

یعنی میں زُہد اور تقویٰ کا طالب نہیں۔ میرے ہاتھ میں تو اَزل ہی میں استاد نے محبت کی طلب کا کاسہ پکڑا دیا تھا۔ ایک اور دوہے میں فرماتے ہیں عشق اور محبت کے علاوہ کسی بھی طریق کو اپنے لیے اختلافی سمجھو۔ جو لوگ اپنی بڑائی کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ منتخب کرتے ہیں مَیں اُن کے ساتھ اختلاف رکھتا ہوں۔ دوہا دیکھیے:

عشق محبت باجھوں جانیں ، بئ سب راہ خلافی
بزرگی کان دُنیا دے کردے، سب نال تلافی (۳۳)

ان کی ایک کافی میں شاہ حسین اور بلھے شاہ کی طرح تمثیلی طور پر، انسان کے بے لاگ ہونے کی صورت یوں دکھائی دیتی ہے ؎

تاب کنوں بے تاب میاں، مَیں تاب کنوں بے تاب
نہ مَیں گویا ، نہ مَیں جویا ، نہ مَیں سوال جواب
نہ مَیں خاکی ، نہ مَیں ہادی ، نہ مَیں آگ نہ آب
نہ مَیں جِنّی ، نہ مَیں اِنسی ، نہ مَیں مائی نہ باپ
نہ مَیں سُنّی ، نہ مَیں شیعہ ، نہ مَیں ڈوہ ثواب
نہ مَیں شرعی ، نہ مَیں ورعی ، نہ مَیں رنگ رباب
نہ مَیں مُلّا ، نہ مَیں قاضی ، نہ مَیں شور شراب
ذات سچل دی کیہی پُچھدا ایں، نالے تاں نایاب (۳۴)

وہ کہتے ہیں: مَیں تاب سے بے گانہ ہوں۔ مَیں نہ طالب ہوں اور نہ ہی مطلوب۔ مَیں سوال بھی نہیں ہوں اور جواب بھی نہیں۔ نہ مَیں خاکی ہوں اور نہ ہی راہ بر، میرا خمیر آگ کا ہے اور نہ ہی مٹی کا جس کے کارن نہ مَیں جِنّوں میں شمار ہوتا ہوں اور نہ ہی انسانوں میں، مَیں تو ماں باپ کی حیثیت سے بھی مبرا ہوں۔ نہ میری شناخت بہ طور شیعہ ہے اور نہ ہی سُنّی۔ مجھے گناہ ثواب سے بھی کوئی لاحقہ نہیں۔ نہ مجھے شریعت نے پابند رکھا ہے اور نہ ہی میں اس سے آزاد ہوں۔ مجھے رقص وسرود سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ نہ میں مُلّا ہوں اور نہ ہی منصبِ قضا سے متعلق ہوں۔ مجھے کسی عہدے اور مرتبے کی طلب نہیں۔ سچل (سرمست) کے بارے میں کیا سوال کرتے ہو یہ تو ہے ہی نہیں۔ بہ قول شاہ حسین: مَیں نا ہیں، سب توں!

چاچڑاں ضلع رحیم یار خاں کے خواجہ غلام فرید کا کلام بھی محبت اور امن کے جذبات سے بھرپور ہے۔ وہ اپنے کلام میں جا بجا انسانیت کے ساتھ تعلق کو مضبوط رکھنے کا درس دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں ہجر اور وِچھوڑے کے تمام بیان وصل اور قرب کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کی ایک کافی کے دو بند ملاحظہ کیجیے جن میں وہ کہتے ہیں کہ کثیر دکھوں دردوں نے سخت تکلیف

میں مبتلا کر رکھا ہے۔ آئے دن وچھوڑا مجھے دُکھ دیتا ہے۔ میں بادشاہی چھوڑ کر غم کی دُنیا آباد کروں گا۔ پھر کیا ہوا اگر لوگ مجھے اس رنگ میں دیکھ لیں۔ اُن کے بول ملاحظہ کیجیے:

درد گھنیرے ، دُکھ ہزاراں
سُول تتی کوں تار متاراں
برہوں بچھیندا روز آزار
سٹ کر شاہی ، تھیساں باندی
ٹھیک سوہیساں رِیت غماں دی
کیہ جو کرسم لوگ وہار (۳۵)

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

دِلڑی غیروں ویروں خالی
صدر صدور ولایت والی
راسخ مالک ملک یقین (۳۶)

پنجابی شعراء میں وارث شاہ، ہاشم شاہ اور محمد بخش کا مقام بھی انسان دوستی اور حقیقت پسندی میں بلند ہے۔ شاہ لطیف بھٹائی نے بھی مذکورہ شعراء کی طرح رومانی قصے لکھے ہیں۔ ان سبھی شعراء کا ان قصوں کو تمثیل کے طور پر پیش کرنا بہت مؤثر رہا اور عام عشقیہ داستانیں پسند کرنے والا طبقہ بھی اس ملفوف شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہاشم شاہ (۱۷۳۵ء۔ ۱۸۴۳ء) اور شاہ لطیف نے سسی پنوں کا قصہ لکھا ہے۔ ان میں ہاشم شاہ کے باقی سارے کلام کی نسبت اُن کی شہرت کا دارومدار اسی قصے پر ہے۔ اسی طرح وارث شاہ کے لکھے قصہ ''ہیر رانجھا'' اور محمد بخش کے ''سفر العشق'' (قصہ سیف الملوک) بھی صوفیانہ تجربوں سے لبریز ہیں۔ ان قصوں میں عاشق کی بے قراری شاعر کی اپنی بے قراری بھی ہے اور قاری و سامع کی بھی۔ کہانی کے ہیرو کو کامیابی کے لیے بہت سی دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا ہوتا ہے۔ ریگستانوں، صحراؤں، انسانوں، غیر انسانوں اور جنگلوں، پہاڑوں سے نبرد آزما عاشق دراصل اپنی منزل کے لیے کوشاں ہے جو دنیاوی کامیابیوں تک پہنچنے کے لیے بھی تحریک ہے اور محبوب اعلیٰ تک رسائی کے لیے بھی ایک راہِ عمل کا درجہ رکھتی ہے۔ وارث شاہ کے مصرعے: وارث شاہ ایس جگ توں اُٹھ جانا اور دِلوں کِبر ہنکارنوں ماریے جی اور وارث شاہ اس رب دی مہر باجھوں بھلا کون ہساوندا رُنّیاں نوں! لوگوں کے لیے امن وسلامتی کی چھاؤں لے کر سامنے آتے ہیں۔

یوں اس علاقے کے صوفیوں نے تصوف کی عالمی اقدار، پیار، محبت، بھائی چارے، حسن سلوک اور رواداری کو

فروغ دینے کے لیے، دوسروں کو تسلیم کرنے اور محبت کو عام کرنے کا راستہ دیا ہے۔ ان شعراء کا کلام پڑھا، گایا اور سماع کی محفلوں میں سنا جاتا ہے جس سے اس کا تاثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ اسی راستے، طریقے اور ڈھنگ سے صوفیہ کی یہ دھرتی وقتاً فوقتاً اُبھرنے والی گھٹن سے نکلتی ہے۔ تعصّبات کا فروغ ہر پہلو سے ایک منفی عمل ہے اور نفرت پھیلانے والا جلد یا بدیر خود اس نفرت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ آج جب انسانیت ہنکار اور کرودھ کے بوجھ تلے کلبلا رہی ہے، تصوف ان برائیوں کا بہترین توڑ ہے۔ آج کے اخلاقی انحطاط کو فقیر کی خانقاہ روشنی عطا کرسکتی ہے اور بے یقینی کی صورت حال کو یقین، امن اور آشتی میں بدل سکتی ہے۔ اسلام سراپا امن کا مذہب ہے جس کو اِن دنوں کسی رنگ دار عینک سے دیکھ کر کسی اور جہت سے آنکا جارہا ہے۔ اسلام میں دنیاداری اور دنیا سے گریز کی کوئی صورت نہیں۔ یہاں صوفی اور فقیر معاشرے کا ایک کارآمد پرزہ ہے جو کٹتے پھٹتے معاشرے کو باہم جوڑ کر رکھنے کا اہم کردار انجام دیتا ہے اور خانقاہ ایک ایسا ادارہ ہے جو انسانی معاشروں میں کھلتی، ٹوٹتی کڑیوں کو دوبارہ سے جوڑنے اور جُڑے رہنے کے لیے اخلاقی اور روحانی مواد فراہم کرتا ہے کہ یہ علم ودانش کا مرکز ہے۔

حواشی:

(۱) قرآن مجید، سورۃ عنکبوت (۲۹)، آیت ۶۹۔

(۲) قرآن مجید، سورۃ الجمعہ، (۶۲)، آیت ۲۔

(۳) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث: ۴۸۔

(۴) علی بن عثمان ہجویری، کشف المحجوب، مترجمہ: غلام معین الدین نعیمی (لاہور: زاویہ، ۲۰۰۴ء)، ص ۷۹۔

(۵) Mysticsm, and Logic by Hibbert Journal (A Quarterly Review of Religion, Theology and Philosophy) Williams & Norgate, London, vol-xiii, 1914-15 p112

(۶) قرآن مجید، سورہ حدید (۵۷)، آیت ۲۷

(۷) Norman Geisler and William D. Watkins (2003), Worlds Apart: A Handbook on World Views, Second Edition, Wipf, ISBN 978-1592441266, pages 75-81

(۸) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، جلد ۲ (ملتان: مکتبہ فاروقیہ، ۱۹۷۷ء، ص ۱۶)

(۹) ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، جلد ۲ ص ۱۹۔ یہ روایت بلاذی، ابن حبیب اور ابن سید الناس وغیرہ نے بھی کی ہے۔

(۱۰) تاریخ امم والملوک، ابن جریر طبری، جلد ۲ (بیروت: س ن)، ص ۹۱۔۷۱

(۱۱) السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۹۔

(۱۲) Mystical Islam, Julian Baldick, I.B.Tauris & Co. Ltd, London 2012 pp37-53

(۱۳) Adi Shankara (Translated by C Johnston), The Atma-Bodha (self-wisdom) Shankara-Acharya at Google Books, Divine Life Press Chicago, p18

(۱۴) مدھودیو یاداس (مرتّب)، بھگوت گیتا، باب ۱۶، اشلوک ۳ (نئی دہلی: ۱۹۷۲ء)

(۱۵) Words of Ecstasy in Sufism, Carl W. Ernst, State Univ of New York, 1984 p43)

(۱۶) مسلم اُردو نیوز ای پیپر، فکر وخبر ای پیپر، تقریب نیوز اور ایشیاء ٹائمز وغیرہ ۳۰ جون ۲۰۱۳ء تا ۲۹ جنوری ۲۰۱۶ء اور مختلف انٹرنیٹ ویڈیو۔

(۱۷) شریف احمد شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، جلد ۳، حصہ اوّل (گجرات: ادارہ معارف نوشاہیہ، ساہن پال، ۱۹۷۰ء)، ص ۳۸۔

(۱۸) راحت القلوب، ملفوظات بابا فرید گنج شکر، مرتّبہ: خواجہ نظام الدین اولیاء، مترجمہ: ملا واحدی دہلوی (لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۰۶ ہجری)، ص ۲۷۔

(۱۹) محمد آصف خاں (مرتّب)، آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۱ء)، ص ۶۷۔

(۲۰) ایضاً، ص ۷۸۔

(۲۱) ایضاً، ص ۵۹۔

(۲۲) محمد آصف خاں (مرتّب)، کافیاں شاہ حسین (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۲۰۱۴ء)، ص ۵۱۔

(۲۳) ایضاً، ص ۵۸۔

(۲۴) ایضاً، ص ۱۰۶۔

(۲۵) سلطان الطاف علی، ڈاکٹر (مرتّب)، ابیات باہو (جھنگ: حضرت غلام دستگیر اکیڈمی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۸ء) ص ۱۱۰۔

(۲۶) محمد آصف خاں (مرتّب)، آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۲ء)، ص ۲۴۷۔

(۲۷) ایضاً، ص ۲۳۹۔۲۳۶

(۲۸) ایضاً، ص ۲۸۹۔

(۲۹) عبدالماجد بھرگڑی (مرتّب)، شاہ سائیں جو رسالو (ای بک ایڈیشن دسمبر ۲۰۰۴ء)، ص ۳۱۔

(۳۰) ایضاً، ص ۶۲۔

(۳۱) ایضاً، ص ۱۰۸۔

(۳۲) شفقت تنویر مرزا (مرتّب)، آکھیا سچل سرمست نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۶ء)، ص ۲۸۲۔

(۳۳) ایضاً، ص ۲۹۲۔

(۳۴) ایضاً، ص ۳۰۱۔

(۳۵) محمد آصف خاں (مرتّب)، آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۴ء)، ص ۹۹۔

(۳۶) ایضاً، ص ۲۱۱۔

مآخذ:

۱۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، جلد ۲، ص ۱۹۔

۲۔ السیرۃ النبویہ، ابن ہشام، جلد ۲، ملتان: مکتبہ فاروقیہ، ۱۹۷۷ء۔

۳۔ تاریخ امم والملوک، ابن جریر طبری، جلد ۲، بیروت: س ن۔

۴۔ راحت القلوب، ملفوظات بابا فرید گنج شکر، مرتّبہ: خواجہ نظام الدین اولیاء، مترجمہ: ملا واحدی دہلوی، لاہور: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، ۱۴۰۶ ہجری۔

۵۔ سلطان الطاف علی، ڈاکٹر (مرتّب)، ابیات باہو، جھنگ: حضرت غلام دستگیر اکیڈمی، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۸۸ء۔

۶۔ شریف احمد شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، جلد ۳، حصہ اوّل، گجرات: ادارہ معارف نوشاہیہ، ساہن پال، ۱۹۷۰ء۔

۷۔ شفقت تنویر مرزا (مرتّب)، آکھیا سچل سرمست نے، لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۶ء۔

۸۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبریل النبی عن الایمان والاسلام والاحسان، حدیث: ۴۸۔

۹۔ عبدالماجد بھرگڑی (مرتّب)، شاہ سائیں جو رسالو، ای بک ایڈیشن دسمبر ۲۰۰۴ء۔

۱۰۔ قرآن مجید، سورہ حدید (۵۷)، آیت ۲۷

۱۱۔ قرآن مجید، سورۃ عنکبوت (۲۹)، آیت ۶۹۔

۱۲۔ قرآن مجید، سورۃ الجمعہ، (۶۲)، آیت ۲۔

۱۳۔ کشف المحجوب، علی بن عثمان ہجویری، مترجمہ: غلام معین الدین نعیمی، لاہور: زاویہ، ۲۰۰۴ء۔

۱۴۔ محمد آصف خاں (مرتّب)، آکھیا بابا فرید نے، لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۹۴ء۔

۱۵۔ مدھو دیو یاداس (مرتّب)، بھگوت گیتا، باب ۱۶، اشلوک ۳، نئی دہلی: ۱۹۷۲ء۔

۱۶۔ Norman Geisler and William D. Watkins (2003), Worlds Apart: A Handbook on World Views, Second Edition, Wipf, ISBN 978-1592441266, pages 75-81

۱۷۔ Mystical Islam, Julian Baldick, I.B.Tauris & Co. Ltd, London 2012 pp37-53

۱۸۔ Words of Ecstasy in Sufism, Carl W. Ernst, State Univ of New York, 1984 p43)

۱۹۔ Adi Shankara (Translated by C Johnston), The Atma-Bodha (self-wisdom) Shankara-Acharya at Google Books, Divine Life Press Chicago, p18

۲۰۔ Mysticsm, and Logic by Hibbert Journal (A Quarterly Review of Religion, Theology and Philosophy) Williams & Norgate, London, vol-xiii, 1914-15 p112